© rasailojaraid.com

فتویٰ اور اصول فتویٰ: چوتھی قسط:

فتوی دینے کے اصول وهدایات

ضبط وترتیب

مولانا مفتی ابو الحسن عظمت اللہ بنویؒ

استاد شعبہ تخصص فی الفقہ بجامعہ المرکز الاسلامی پاکستان بنوں

شرکاء تخصص فی الفقہ والافتاء کے لئے علمی ابحاث پر مشتمل مضمون جو درحقیقت حضرت الاستاد الاکبر فقیہ العصر مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ نے موقعہ بموقعہ دورانِ درس درجہ ذیل باتیں املاء کرنے کی تاکید کی تھی اہل علم وتحقیق حضرات کے دلچسپی کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ از مدیر مسئول ....

فقہ اسلامی کے مأخذ ومراجع:

مأخذ کی تعریف:

مأخذ سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے قانون اخذ کیا جاتا ہے۔

مأخذ کی قسمیں:

کتب قانون میں مآخذ کی دو قسمیں ہیں، مآخذ صوری، مآخذ مادی:

ماخذ صوری قانون کا وہ ماخذ ہے جس سے قانون اپنا جواز واثر حاصل کرتا ہے۔

اور مادی وہ مأخذ ہے جس سے قانون اپنے مواد حاصل کرتا ہے۔

فقہ اسلامی کے مادی مأخذ:

علامہ شاطبی فرماتے ہیں: **الادلة الشرعية ضربان احدما يرجع الى النقل المحض والثانى مايرجع الىٰ الرأى فاما اصل الاول الكتاب والسنة واما الثانى فالقياس والاستدلال . وان الادلة الشرعية محصورة فى اصلها لا نالم نثبت الضرب الثانى بالعقل بل استثناه بالأول اذمنه قامت صحة الاعتماد عليه . (الموافقات ص ۴۱).**

فقہ اسلامی کا دوسرا مأخذ سنت ہے:

اصطلاح فقہ میں آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات ہیں۔ اور اقوال صحابہ تابع سنت ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نورالانوار میں ہے: " السنة تطلق علیٰ قول الرسول وفعله وسکوته وعلیٰ اقوال الصحابة وافعالهم " .

قرآن کریم میں سنت کو بنیادی شریعت وحکم قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: " انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس م " ...... (نساء ۱۰۶) .

علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں:

" فکانت السنة بمنزلة التفسیر والشرح المعانی الاحکام وای الکتاب "

نیز حضرت عمرؓ نے قرآن فہمی کے سلسلے میں سنت کی تشریحات کو بنیاد بناتے ہوئے فرمایا ہے:

" سیاتی قوم یجادلونکم شبهات القرآن فخذوهم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ تعالیٰ ". (المیزان للشعرانی ص ۱/۵۳).

سنت کے بارے میں ائمہ اربعہ کا قول:

لولا السنن مانفهم احدمنا القرآن (المیزان ص ۱/۵۵).

ترجمہ: اگر سنتیں نہ ہوتیں تو ہم میں سے کوئی بھی فہم قرآن نہ کر پاتا۔

فرمودات نبوی کی عمومی حیثیت سے دو قسمیں ہیں:

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے آپ کے فرمودات کی عمومی حیثیت سے دو قسمیں بیان کی ہیں ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض اور تبلیغ رسالت سے ہیں۔ اس میں عقائد اخلاق، عبادات، معاملات، مآدوغیرہ سے متعلق تفصیلات شامل ہیں۔

اور دوسری قسم وہ جن کا تعلق شورہ اور رائی سے ہے۔ چنانچہ اس قسم میں سیاسی مصلحت سے متعلقہ احکام، وہ امور جن کو شخص، قومی، ملکی عادات ورواج کے مطابق اختیار کیا گیا ہو۔ یا عربوں کے بعض تجربات، علاج زراعت، باغبانی وغیرہ کے متعلق تفصیل ہیں۔

فقہ اسلامی کا تیسرا ماٗخذ اجماع ہے:

اجماع لغت میں عزم واتفاق کو کہتے ہیں۔ اصطلاح فقہاء میں اجماع کسی معاملہ میں اہل حل وعقد کے اتفاق کو کہتے ہیں۔

اجماع کا حجت ہونا کتب وسنت سے ثابت ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یاایها الذین امنو اطیعو اللہ واطیعوالرسول واولی الأمر منکم . (نساء ۷۴)

ترجمہ: "اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور ان کا جو صاحب امر ہیں"۔

اکابر علماء اور فقہاء کرام نے اس آیت سے اجماع کو ثابت کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اجماع کا منکر جہنمی نہیں۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاتھ ہے مسلمانوں کی جماعت پر جس نے جدا راہ اختیار کی وہ دوزخ میں جا پڑا۔

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے: "ما رأه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن"۔

اجماع کی دو قسمیں ہیں:

مولانا عبدالحی صاحب السعایۃ میں فرماتے ہیں کہ عصر حاضر کے مجتہدین کا کسی حکم پر اتفاق کر لینا اجماع شرعی کہلاتا ہے۔اس کی دو قسمیں ہیں، بسیط و مرکب، اگر کسی حکم میں اتفاق علت میں اتفاق کے ساتھ ہو تو یہ اجماع بسیط ہے۔

" کنقض الوضوء بالخارج من احد السبيلين "۔

اور اگر کسی حکم پر اتفاق علت میں اختلاف کے ساتھ ہو تو یہ اجماع مرکب ہے۔

"فان استنبط المجتهدون فی عصر حكماً واتفقوا عليه يجب علىٰ اهل عصر قبوله فاتفاقهم صار بينة علىٰ ذالک الحكم فلا يجوز بعد ذالک مخالفتهم "۔(اھ)

فقہ اسلامی کا چوتھا ماخذ قیاس ہے:

لغت میں اس کے معنی اندازہ کرنا اور مساوات پیدا کرنا ہے اصطلاحِ فقہاء میں قیاس علت اور حکم میں فرع کو اصل کے ساتھ برابر کر دینے کا نام ہے۔یہی تعریف اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

قیاس کی حجیت:

قیاس کا حجت ہونا کتاب و سنت اور اجماع امت تینوں سے ثابت ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: " فاعتبروا يااولىٰ الابصار و "۔ (سورة الحشر)۔

" پس اعتبار کرو اے نگاہ والو "۔

منہاج الاصول میں روایت ہے کہ حضرت معاذؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے ایک ایک علاقہ کا قاضی بنا کر بھیجا تھا اور دونوں سے دریافت کیا تھا کہ فیصلہ کس طرح کرو گے جواب میں دونوں نے عرض کیا تھا۔

"اذالم نجدالحكم فی السنة نقيس الامر باالامر فما كان اقرب الىٰ الحق علملنا به فقال عليه السلام اصبتما۔

(بحواله مقدمة السعاية ص ۵۲)۔

صحابی کے عمل سے قیاس کا ثبوت:

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کلالہ کے وراثت کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا تو فرمایا: اقول فيها برأى فان يكن صواباً فمن الله وان يكن خطأً فمنى ومن الشيطان۔ (منهاج)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شروط قیاس:

(۱) اصل حکم خلاف قیاس نہ ہو۔

(۲) فرع میں کوئی نص صریح نہ ہو۔

(۳) حکم میں تعدیت کی صلاحیت ہوتو بوقتیکہ فرع اصل کے نظیر ہو۔

(۴) فرع میں حکم میں متغیر نہ ہو۔

(۵) قیاس نص صحیح معمول بہ کے معارض ومنافی نہ ہو۔

(۶) فرع نزول حکم کے حوالے سے اصل سے مقدم نہ ہو بلکہ فرع باعتبار الحکم مؤخر ہو اصل سے " **کوجوب النیة فی التیمم فلا یقاس علیه النیة فی الوضو لان حکم لتیمم نزلت بعد الهجرة والو ضو قبلها**"۔

استحسان:

درحقیقت ہی قیاس ہی کی ایک نوع ہے۔ جو ادلۂ اربعہ میں داخل ہے۔ اور کسی وجہ سے قیاس جلی کو ترک کر کے اس کو اختیار کیا جائے۔ استحسان (قیاس خفی) اس دلیل کو کہتے ہیں جو قیاس جلی کی معارض ہو یعنی قیاس جلی ایک حکم چاہتا ہو اور اثر (اجماع)، ضرورت، اور قیاس خفی اس کی ضد کو چاہتا ہو تو قیاس کو چھوڑ کر استحسان کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ استحسان باالاثر جیسے بیع سلم کہ قیاس مقتضی عدم جواز ہے کیونکہ بیع سلم میں معدوم کی بیع ہوتی ہے حالانکہ بیع کے لئے بیع کا موجود و مملوک اور مقدور التسلیم ہونا ضروری ہے۔

مگر اس قیاس کو نبی ﷺ کے اس قول پر " **من اسلف فی شئی فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الیٰ اجل معلوم اور استحسان باالا جماع** " .

کما فی الاستصناع بغیر ذکر الاجل والا ستحسان بالضرورة کعدم طهارة الاولیٰ لأنها لاتنعصر بالعصر والا ستحسان بالقیاس الخفی کطهارة السباع الطیور لا نها تاکل بمنقارها وهو عظم طاهر"۔

صحابہ کے طرز عمل سے استحسان کا ثبوت:

" **کزوجة ماتت وترکت زوجاً واُمّاً واخوین شقیقین والا خوة لام خفی الصورة المذکورة للزوج النصف والسدس للام والثلث للا خوة لام قیاسی** "

قاعدہ کے مطابق اس تقسیم سے سگے بھائی کو محروم ہونا پڑا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ واقعہ پیش ہوا تو انہوں نے سگے بھائیوں کے نقصان دفعیہ کی غرض سے قیاسی قاعدہ چھوڑ دیا اور ان کو ماں شریک بھائیوں میں شامل کر کے تہائی میں سب کو حقدار بنایا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فقہ حنفی میں مفہوم مخالف کا اعتبار:

زبان سے جو بات نکلتی ہے اس کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ایک منطوق کلام دوسرا مفہوم کلام منطوق اصولیین اور علماء معانی کی اصطلاح میں ہو۔" مادل علیه صریح اللفظ وسیاق العبارة دلالة اللغویة " . کو کہا جاتا ہے۔(معارف السنن ۱/۵۵).

اور مفہوم "ما یستنبط من فحوی الکلام ".(معارف السنن ۱/۵۵).

یعنی مفہوم کلام سے اس کا استنباط اور استخراج ہوتا ہے ظاہر الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے بلکہ وہ کلام میں غور اور فکر کرنے سے نکالا جاتا ہے۔

مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: " ولا تقل لهما أفٍ " . (الاية) .

کہ والدین کو اُف نہ کہو اس آیت کا ظاہری معنیٰ اُف کے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔

ظاہر الفاظ سے سب وشتم یا مارنے کی کوئی ممانعت نہیں مگر غور فکر کرنے کے بعد سب وشتم اور مارنے کی حرمت اس آیت سے مستنبط ہوتی ہے اس کو مفہوم الکلام کہا جاتا ہے۔

مفہوم کے اقسام:

مفہوم کلام کی دو قسمیں ہیں:

(۱) مفہوم موافق، (۲) مفہوم مخالف۔

اگر کلام کا مفہوم منطوق کلام کے موافق ہو یعنی مفہوم بھی اس حکم کے اثبات پر دلالت کرے جس کے اثبات پر منطوق دلالت کرتا ہے۔ تو اس کو مفہوم موافق کہا جاتا ہے۔

اور اگر مفہوم کلام منطوق کے ضد کو ثابت کرے تو اس کو مفہوم مخالف کہا جاتا ہے۔

اور اس کو دلیل خطاب بھی کہا جاتا ہے۔

مفہوم مخالف کے اقسام:

مولانا یوسف بنوریؒ نے معارف السنن میں مفہوم مخالف کے دس اقسام ذکر کیے ہیں۔

(۱) مفهوم الصفة، (۲) مفهوم الشرط ، (۳) مفهوم علت ، (۴) مفهوم غاية ، (۵) مفهوم عدد ، (۶) مفهوم لقب ، (۷) مفهوم استثناء، (۸) مفهوم حصر ، (۹) مفهوم زمان ، (۱۰) مفهوم مكان .(معارف السنن ۱/۵۵).

مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ (رئیس مفتی دارالعلوم دیوبند) نے ان دس اقسام سے پانچ اہم اقسام کی کی تعریفات مع امثلہ ذکر فرمائی ہیں۔ تفصیل ذیل میں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اول مفہوم الصفت:

کہ کوئی حکم اسم صفت پر لگائی جائے تو جہاں وہ صفت نہ رہے گی تو حکم بھی نہ رہے گا۔ جیسے کہ حدیث نبوی ﷺ ہے۔ "فی السائمة زکوٰة"، یعنی جنگل کی گھاس پر چرنے والے چوپائیوں میں زکوٰۃ ہے۔ اس قول میں لفظ السائمة اسم مشتق ہے جو صفت پر دلالت کرتا ہے۔ پس جو جانور سائمۃ نہ ہوں گے بلکہ علوفۃ ہوں گے ان میں زکوٰۃ نہ ہوگی۔

" ولقوله عليه الصلوٰة والسلام في كل ذات كبر رطة اجرفان وصف رطوبة الكبريعم جميع الحيوانات كان ذالك دليلا علىٰ نفيه اى نفى الحكم عند عدم ذالك الوصف كما لو نص عليه اه".

(كشف الاسرار ٢/ص ٢٥٦).

ثانی مفہوم شرط:

کوئی حکم کسی شرط کے ساتھ معلق کی جائے تو شرط جب منتفی ہوگی تو حکم بھی منتفی ہوگا۔ جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

" وان كن أولات حمل فانفقوا عليهن " . (الاية) .

اور اگر مطلقہ عورتیں حمل والی ہو تو حمل پیدا ہونے تک ان پر خرچ کرو۔

اس آیت میں نفقے کو وجوب حالت حمل پر موقوف رکھا گیا ہے تو جب حمل کا وضع ہو جائے تو پھر نفقہ لازم نہ ہوگا۔

ثالث مفہوم غایت:

یعنی حکم کی کوئی حد مقرر کی گئی ہو تو اس غایت پر حکم خود بخود منتفی ہو جائے گا۔ جیسے (حتیٰ تنكح زوجا غيره) . (الاية)

مطلقہ ثلاثہ شوہر کے لئے حرام ہے یہاں تک کہ وہ اس شوہر اول کے علاوہ کسی اور شخص سے نکاح کردے۔

گویا کہ شوہر ثانی سے نکاح کرنا اور ازدواجی زندگی قائم کرنے تک یہ عورت (مطلقہ ثلاثہ) شوہر اول پر حرام ہوگی اس کے بعد حرمت ختم ہو جائے گی اگر یہ دوسرا شوہر اس کو طلاق دے اور یہ عورت شوہر اول سے عدت کے بعد نکاح کرنا چاہتی ہو تو کر سکتی ہے۔

رابع مفہوم عدد:

یعنی حکم کے کوئی تعداد بیان کی گئی ہو تو وہ زائد کی نفی کریگا۔ جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے: " ثمانين جلدة " . (الاية) .

یعنی تہمت لگانے والوں کو اسی/۸۰ کوڑے مارو۔

اس آیت میں قاذف کے لئے حد قذف کی تعداد اسی/۸۰ کوڑے رکھی گئی ہے۔ اس سے کم یا زیادہ دونوں دینا جائز نہیں اس طرح غیر محصن شخص جب زنا کرے تو قرآن کریم نے اس کے (مائة جلدة) (الاية) . یعنی سو کوڑے سزا رکھی ہے۔ اس لئے غیر محصن شخص کو سو کوڑوں سے کم یا اس سے زیادہ مارنا جائز نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الخامس مفہوم لقب:

یعنی حکم کسی اسم جامد پر معلق کیا جائے فی الغنم زکوٰۃ کہ بھیڑ بکریوں میں زکوٰۃ ہے۔اھ (آپ فتویٰ کیسے دیں۔ص ۱۰۴) اس حکم شرعی میں زکوٰۃ غنم کے ساتھ معلق کیا جائے اور لفظ غنم لغت میں بھیڑ بکریوں دونوں کو شامل ہے۔

" وتسکو ابقوله عليه السلام الماء من الماء فلا يوجب الغسل بالا كسال روتمسک الجمهور بقوله تعالیٰ فلا تظلموا فيهن انفسكم اى فى الأشهر الاربعة الحرم وهى رجب وذو القعده وذوالحجة والمحرم ولم يدل ذالک علىٰ اباحة الظلم فى غيرها. وقال تعالیٰ ولا تقولن لشئى انى فاعل ذالک غدا الاان يشاء الله اى الا ان شاء الله ثم لم يدل ذالک علىٰ تخصيص الاستثنا با لغدون غيره ام " . (کشف الاسرار ج ۲/ص ۲۵۴).

السادس مفہوم العلۃ:

یعنی حکم کسی علت کے ساتھ معلق ہو جیسے آپ ﷺ نے زکوٰۃ لینے سے نبی ہاشم کو منع کیا ہے اور اس کی ''علت اوساخ الناس یاخمس'' قرار دیا ہے۔

السابع مفہوم الاستثناء:

یعنی کوئی حکم استثناء کے ذریعہ ماقبل حکم سے نکالا جائے جیسے کہ مثال کے طور پر " (الا من اغترف غرفة بيده) والا من ضطر ".

الثامن مفہوم الحصر:

یعنی حکم کو کسی خاص شئی کے ساتھ منحصر کیا ہو جیسے '' الحج العرفة '' کہ حج عرفہ کا نام ہے یعنی حج کی ادائیگی وقوف عرفہ میں منحصر ہے۔

التاسع مفہوم الزمان:

یعنی حکم کسی زمانہ کے ساتھ معلق ہو جیسے (ان الصلوٰة كانت على المؤمنين كتابا موقوتاً) اسی طرح (من شهد منكم الشهر فليصمه). کہ رمضان کا فرض روزہ شہر رمضان کے ساتھ معلق ہے۔

العشرۃ مفہوم المکان:

یعنی حکم شرعی کسی خاص مکان کے ساتھ متعلق ہو۔

جیسے (واليطوفوا بالبيت العتيق) یعنی حکم طواف صرف بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ کے ساتھ خاص ہے کسی اور جگہ کا طواف کرنا جائز نہیں۔

مفہوم کا حکم:

أئمہ مجتہدین کا اجماع اور اتفاق ہے کہ مفہوم موافق معتبر ہے اس لئے کہ وہ دلالت النص سے حکم کا اثبات کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

البتہ مفہوم مخالف میں ائمہ کا اختلاف ہے شوافع اور متبع مفہوم مخالف مفہوم لقب کے علاوہ مطلقا حجیت کے قائل ہیں اور جملہ اقسام کو معتبر مانتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ شوافع کے ہاں مطلقہ بائنہ جو حاملہ نہ ہو شوہر کو ایام عدت میں نفقہ دینا لازم نہیں۔اور نہ علوفہ یعنی گھر میں پالتو جانور میں زکوٰۃ ہیں وغیرہ۔

احناف کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ ان کے ہاں مفہوم مخالف کا کوئی اعتبار نہیں لیکن محققین کے تحقیق کے مطابق حنفیہ کا یہ مذہب نہیں۔

کہ مفہوم مخالف کا کوئی اعتبار نہیں علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"والحق ان نفیه' مطلقاً غیر صحیح" کما ان اثباته مطلقاً کذلک غیر صحیح بل یحتاج الیٰ بیان نکات وفوئد اللشروط والقیود والصفات التی وردت فی النصوص . (معارف السنن ۱/۵۵).

ہاں ایسا نہیں کہ اس مفہوم مخالف سے حکم منصوص کو رد کیا جائے بلکہ مفہوم مخالف سکوت عنہ حکم کے لئے دلیل بن سکتا ہے۔ (معارف السنن۱/۵۵)۔

امام المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

" اعتبار ة فی مرتبة المحکمة والنکة والفائدة . لا ن الکلام البیغ یقتضی ذلک کیلا یشتمل علی حشو فی الکلام ولغو فی الغرض وایضاً لو لم نعتبره فی هذه المرتبة لالغیت فائدة القیود والصفات فی کلام البلیغ وکلام الله سبحانه' . (معارف السنن ۱/۵۵).

اس لئے علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

کہ حنفیہ کے نزدیک نصوص شرعیہ یعنی کلام اللہ اور کلام رسول اللہ ﷺ کے مفہوم مخالف معتبر نہیں البتہ کلام فقہاء مجتہدین اور عوام الناس میں معتبر ہے۔(رسائل شرح عقود۱/۴۱)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حنفیہ نصوص میں غایت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

اس لئے کہ شارع علیہ السلام کا غرض از کلام بہت دقیق ہوتی ہے۔کبھی اس کی ادراک انسانی عقول سے بہت دور ہوتا ہے۔اس لئے ان کے ہاں نصوص میں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں۔(معارف السنن۱/۵۶)۔

اور فقہاء کے عبارات میں اعتبار دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام کا غرض اقرب الی الفہم ہوتا ہے جس کے ادراک میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

علامہ ابن ہمام کتاب التحریر میں فرماتے ہیں:

" والحنیفة ینفون مفهوم المخالفة باقسامه فی کلام الشارع فقط " .

چنانچہ التحریر کے شارح ابن امیر الحاج جو ابن ہمام کے شاگرد ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شمس الائمۃ الکردری سے نقل کرتے ہیں۔

" ان تخصيص الشئی بالذکر لايدل علی نفی الحکم عما عداه فی خطابات الشارع فاما فی متفاهم الناس وعرفهم فی المعاملات والعقليات فيدل اه ". (معارف السنن ۱ / ۵۶).

اعتبار کی مثالیں:

فقہی عبارات میں مفہوم مخالف کے اعتبار کی بہت سی مثالیں ہیں مثلاً صاحب ھدایۃ علامہ مرغینانی غسل کے بحث میں فرماتے ہیں کہ عورت پر بٹی ہوئی چوٹیاں کھولنا واجب نہیں شارحینؒ نے لکھا ہے کہ عورت کے لفظ سے مرد سے احتراز مقصود ہے چونکہ اگر مرد نے چوٹیاں بٹی ہوئی ہو تو اس کے کھولنا ضروری ہے۔

اس طرح صاحب ہدایہ نے کتاب الحج کے باب الجنایات میں لکھا ہے۔ کہ جب درندہ کسی حاجی پر حالت احرام میں حملہ کردیں اور محرم اپنے بچاؤ کے لئے اس کو قتل کردیں۔ تو اس پر محرم پر کوئی جزاء لازم نہیں۔ شارحین نے لکھا ہے کہ اگر محرم ابتداء کرے تو اس پر اس درندے کہ جزء لازم جیسا کہ قرآن کا حکم ہے۔

اس کے علاوہ بھی کافی ساری مثالیں فقہی ذخائر میں موجود ہے جس میں مفہوم مخالف کا اعتبار کیا گیا ہے۔

صحابہ کرام کے اقوال:

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے شرح عقود رسم المفتی میں لکھا ہے کہ صحابہ کرام کے اقوال دو طرح کے ہیں۔

(۱) وہ اقوال جو مدرک العقل نہیں یعنی اس میں رائے اور اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہوتا اسے ارشادات چونکہ حکماً مرفوع ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی احادیث نبوی ﷺ کی طرح مفہوم مخالف معتبر نہیں۔

(۲) اور جن اقوال میں رائے اور اجتہاد کی گنجائش ہو سکتی ہو تو اس میں مفہوم مخالف معتبر اور اس کے عوض ایک دنبہ ذبح کیا اور فرمایا کہ ہم نے ابتداء کی تھی۔

آپ کے قول ہم نے ابتداء کی تھی سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کا مقصد یہ ہے۔ کہ جب درندہ ابتداء کرے تو پھر جزا لازم نہیں۔

شارح کے اقوال: امام محمدؒ نے سیر کبیر۔ کے بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قول شارح میں بھی مفہوم مخالف کو اعتبار دیا ہے۔

" ان رسول الله كتب الی مجوس هجر بدعوه الی الاسلام فمن اسلم قبل منه ومن لم يسلم ضربت عليه الجزية وان لايؤكل لهم ذبيحة ولاينكح لهم امرأة ".

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر مجوس کو مراسلہ روانہ فرمایا جس میں ان کو اسلام کی دعوت دی پھر جو مسلمان ہو جائے اس کا اسلام قبول کرلیا جائے اور جو مسلمان نہ ہو اس پر جزیہ مقرر کیا جائے اور مجوسیوں کا ذبیحہ نہ کھایا جائے نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ سرخسیؒ شرح میں لکھتے ہیں:

" مکانه استدل بتخصیص رسول الله المجوس بذلک علی انه لابأس بنکاح نساء اهل الکتاب فانه بنی هذا الکتاب علی ان المفهوم حجة " . (سیر کبیر ۱/۱۴۹)

گویا امام محمدؒ نے رسول اللہ ﷺ کے مجوسیوں کے اس حکم کے ساتھ تخصیص فرمانے سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی گنجائش ہے۔ کیونکہ امام محمد نے اپنی کتاب کا مدار اس بات پر رکھا ہے کہ مفہوم مخالف حجت ہے۔

امام محمدؒ کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ قول شارح میں بھی مفہوم مخالف کو معتبر مانتے ہیں۔ مگر اکثریت کی رائے نصوص میں معتبر نہیں اصح اور اولیٰ ہے۔ البتہ جہاں قرینہ ہو یا کسی کوئی اور دلیل جو اس بات پر دلالت کرے کہ شارع علیہ السلام کے اس قول میں مفہوم مخالف معتبر ہے۔

یا کسی نکتہ کے لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہو تو ان جملہ صورتوں میں معتبر ہوگا۔ ورنہ عمومی طور پر معتبر نہیں جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

" وربائبکم التی فی حجورکم الایه " یعنی حرام کی گئی تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گود میں (پرورش) میں ہے۔

اس آیت میں حجور کی قید کا فائدہ بالا جماع یہی ہے کہ عام طور پر بیوی سابق شوہر سے لڑکی دوسرے شوہر کی پرورش میں ہوتی ہے۔ لیکن جب مطلب کسی کے ہاں نہیں۔ کہ اگر وہ لڑکی موجود شوہر کی پرورش نہ ہو بلکہ سابق شوہر کے کسی رشتہ دار کسی اور شخص کی پرورش میں ہو تو شوہر کی نکاح جائز ہے۔

لہٰذا اگر نصوص میں مفہوم مخالف کا اعتبار کیا جائے تو اسی صورت میں اپنی بیٹی (ربیبة) سے نکاح لازم آئے گا جو بالا جماع حرام ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ نصوص میں مفہوم معتبر نہیں۔

فقہی روایات میں اگر چہ معتبر ہے لیکن اعتبار کی وجہ سے عرف اور عادت ہے اور فقہاء الثابت بالمعرف کالثابت بالنص اور المعروف کالمشروط سے قواعد سے عمومی طور پر استدلال کرتے ہیں۔ چونکہ لوگوں نے اپنے محاورات میں مفہوم مخالف کو اعتبار دیا ہے۔ اس لئے کلام الناس میں معتبر ہے۔

فقہاء اور علماء کی اپنی کتابوں میں یہ عادت رہی ہے کہ قیود اور شروط وغیرہ میں یہ تنبیہ کرتے ہیں کہ جہاں یہ قید بالشرط نہ ہو وہ حکم سے خارج ہے۔ اس لئے فقہی عبارت میں بھی مفہوم کو اعتبار ہے۔ بلکہ فقہی ذخائر میں یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ کبھی کبھی فقہی روایات میں بھی معتبر نہیں ہوتا۔

مثلاً: معتبرات فقہ میں ہے۔ کہ طہارت کے سنن میں شامل ہے کہ کوئی شخص دونوں ہاتھوں کو برتن میں نہ ڈالے جب وہ نیند سے بیدار ہو جائے جب تک ان دونوں ہاتھوں کو اچھی طرح دھو نہ لے۔

اس مسئلہ میں نیند سے بیداری کی قید اتفاقی ہے۔ اس لئے کہ جب بھی کوئی شخص نے وضوء ہو جائے تو اس برتن میں ہاتھ ڈالنے سے قبل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دھونا ضروری ہے۔ یہ حکم صرف نیند سے بیدار کے لئے خاص نہیں۔ البتہ فقہی عبارات میں بھی حجت ہے۔ جب وہ کسی صریح ثابت شدہ حکم وہ بات کے مخالف نہ ہو ورنہ صریح حکم مقدم ہوگا۔

قال: ابن نجيمؒ في الأشباه قوله: لايجوز الاحتجاج بالمفهوم في كلام الناس في ظاهر المذهب كاالأدلة اه قال البيرِ في حاشية قوله: كاالأدلة الخ. اقول نظير ذالک تخصيص التئ بالذكر لايدل علىٰ نفسى الحكم مما عداه في خطاب الشرع ، واما في الروايات فيدل ذكر ابن الكمال في فعل الجنايات علىٰ الصيد في اشرح الهداية من كتاب الحج:

ثم قال ابن نجيمؒ: وما ذكره محمد في السير الكبيرة من جواز الاحتجاج به فهو خلاف ظاهر المذهب كما في الدعوىٰ من الظهيرية وأما مفهوم الرواية فحجة كما في غاية البيان ، قال الحموى في حاشية قوله:واما مفهوم الرواية فحجة الخ (اقول : وكذالک مفهوم التصنيف حجة ذكره في انفع الوسائل هذه ولا يقال في مفهوم الروايات: ينبغي بل هو مفهوم عبارة الأصحاب ذكره المصنف في الشرح في كتاب الوقف ، وانما كان المفهوم حجة عند نا في الرواية دون النصوص لان المفهوم فيها ليس بمقصود، بخلاف كلام الأصحاب فانه فيه مقصود ، فيكون حجة فيها ، هذا هو الفرق بينهما ، وانه قد خفي علىٰ كثير ين واحفظ واحتفظ به اه كذا في الزهر الباد رعلى فصول العماد ى .

معزيا لمولانا عبدالبربن الشحنه اه :

" وظاهر قول المصنف مفهوم الرواية حجة انه حجة ولو كان مفهوم مخالفة قال العلامة القهستاني في الشرح النقاية في كتاب الطهارة : ان مفهوم المخالفة في الرواية مفهوم الموافقة معتبر بلا خلاف كام ذكره المصنف يعني صدر الشريعة في كتاب النكاح ثم قال: لكن في اجارة الزاهدى انه غير معتبرالحق انه معتبر الا انه اكثرى اه كما في حدود القنية اه " .

(الاشباه والنظائر مع حاشية المحموى ج :٢/ص ١٩٣ كتاب القضاء والشهادة والدعوى) .

القواعد التي تجرى في الفقه الحنفي كالاصول لأساسية تحت المفهوم والمنطوق :

كلام له منطوق ، وهو مايدل عليه صريح للفظ دلا لة لغوية، وله مفهوم وهو مايستنبط من فحوى الكلام ، فان كان المفهوم موافقا للمنطوق يسمىٰ مفهوم الموافقة ، فحوى الخطاب، وان كان المفهوم مخالف وضدالحكم يسمى ، مفهوم المخالفة . ودليل الخطاب، وينقسم مفهوم المخالفة الىٰ:

مفهوم الصفة ، والشرط، والعلة ، والغاية، والعدد، واللقب ، والا ستثناء، والحصر، والزمان ، والمكان ،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فاتفق المجتهدون فی قبول ومفهوم والموافقة، واختلفوا فی "مفهوم المخالفة "

" فالامام الشافعی واتباعه ، رحمهم الله ، اتفقوا علیٰ حجیة مفهوم المخالفة ، بأقسامه فالمفهوم المخالف عندهم حجیة شرعیة .وان کانت ظنیة. فجعلوا التخصیص علی الشئ ولاتخصیص بذکره دلیلاً شرعیاً علیٰ نفی الحکم عما عداه .والحنفیته لایعتیرونه حجة شرعیة بهذٰه المشابهة " .

قال الشیخ ابن الهمام : روالأحناف ینفون مفهوم (المخالفة) بأقسامه فی کلام الشارع فقط ، یعنی أن تخصیص الشئی بالذکر لایدل علیٰ نفی الحکم عما عداه فی خطابات الشرع فأما فی متفاهم الناس وعرفهم وفی المعاملات والعقلیات فیدل أه . (فتاویٰ تتارخانیه ج ۱ / ۲۱).

الدلیل لنا من الاصول علیٰ عدم اعتبار المفهوم فی کلام الشارع تقدالتحقیق ان اقصیٰ درجات الوصف اذا کان المؤثر ان یکون علة الحکم مثل السارق والزانی ولا اثر للعلة فی التقی ومثال هذٰ ایضاً فی قوله تعالیٰ من فیتا تکم المؤمنات فهذا الا یوجب تحریم نکاح الأمة الکتابة عندنا لما قلنا اه (کشف الاسرار ج ۲ / ۲۵۹).

تمرین فتویٰ:

تمرین افتاء میں سب سے پہلا مرحلہ سوال کا انتخاب ہے۔اس میں مندرجہ ذیل باتوں کا اہتمام ضروری ہے:

الف:۔سال اول میں ابتداءً آسان استفتاء لیا جائے ،اگر سوال ایسا ہو کہ جس میں کوئی نہ کوئی جزئیہ مل سکتا ہو تو وہ بہتر ہے،البتہ ہر وقت آسان اور جزئیہ والے استفتاء ہی ملنا ضروری نہیں،اس لئے اساتذہ کرام کے مشورے سے دوسرا استفتاء بھی لیا جا سکتا ہے

ب:۔ہر قسم کے موضوع کے استفتاء لیکر حل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے،صرف ایک ہی موضوع مثلاً نماز یا زکوٰۃ یا چند مخصوص موضوعات سے تمرین نہ ہو سکے گی، جو آگے چل کر مشکل کا سبب ہو گی۔

ج:۔استفتاء لینے سے قبل اس رجسٹر میں اندراج ضروری ہے،تاکہ ضرورت پڑنے پر جلد تلاش کیا جا سکے،ہر استفتاء پر اندراج نمبر ہوگا، رجسٹر میں مجیب کا نام، مستفتی کا نام اور اندراج نمبر کے ساتھ وصولی کی تاریخ درج ہوگی،اسی طرح حل کرنے کے بعد جمع کروا کر واپسی کی تاریخ درج کی جائے گی۔ڈاک سے آمدہ استفتاء لیتے ہوئے جوابی لفافہ اور استفتاء پر درج جوابی پتہ کو ملا کر تسلی کر لی جائے ،اور مناسب معلوم ہو تو جوابی لفافے پر ایسی علامت لگائیں جس سے خلط کا امکان باقی نہ رہے،اور نہ کسی ایک کا جواب دوسرے کے لفافے میں جانے کا قوی خطرہ ہے۔

دوسرا مرحلہ حل استفتاء ہے:

اس میں دو کام بنیادی ہوتے ہیں: نکتۃ الغور کی تعین اور مراجع ومظان مسئلہ (جہاں مسئلہ ملنے کا گمان ہو) کا درست انتخاب،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جواب کی صحت ان دونوں امور کے صحیح طور سے انجام دینے پر موقوف ہے، لہٰذا اس میں پوری جانفشانی اور ہمت وچستی سے کام لیں، اس کا طریقہ سنداً دلۂ یہ ہے:

نکتۃ الغور کی تعیین:

استفتاء لینے کے بعد کتب کی مراجعت سے پہلے اسے کئی بار اچھی طرح غور سے پڑھ کر اس کا تجزیہ وتحلیل کیا جائے، اہم نکات کو متعین کر دیا جائے، ضرورت محسوس ہو تو انہیں خط کشیدہ بنایا جائے، مستفتی نے کئی باتوں کو بے ترتیب جمع کیا ہوتا ہے، ان کی طرف التفات کے بجائے اصل مسئلہ کو سمجھنا اجزاء سوال کو ترتیب کر کے اس کا جواب سوچنا تمرین میں اصل ہے، نکتۃ الغور سمجھنے سے یہی مراد ہے۔

○ سوالات کے موضوعات بے شمار ہوتے ہیں، اور مفتی کے وسائل محدود، ایسا ممکن نہیں کہ ہر چیز اسے اپنے پاس دستیاب ہو سکے، محدود وسائل میں رہتے ہوئے جامع اور مستند تحقیق کا طریقہ ہے کہ وسائل جہاں موجود ہیں وہیں پہنچ کر ان سے استفادہ کیا جائے، اور مطلوبہ معلومات جس فن سے تعلق رکھتی ہیں، اس کے ماہر افراد سے حقیقت دریافت کی جائے، طبی امر کی تحقیق ڈاکٹروں سے کی جائے اور تجارتی معاملے کی دکانداروں سے، بیمہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بیمہ دفتر جایا جائے، اور آڑھتیوں کے معاملات سمجھنے کے لئے منڈی میں، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے: وہ بازار میں آمد ورفت اور تاجروں کے ساتھ نشست وبرخاست رکھتے تھے، تاکہ ان کے درمیان رائج عقود کی حقیقت علی وجہ البصیرۃ معلوم کر سکیں، کسی نے ان سے اتنی محنت کرنے اور عامیوں کے پاس اٹھنے بیٹھنے کی مشقت برداشت کرنے کا سبب پوچھا تو فرمایا: "**ما ظنک فی رجل جعل الناس عنقه جرا یحرون علیها**". (او کما قال)

○ جواب لکھنے کا طریقہ احمقانہ ہے کہ آپ استفتاء پڑھتے ہی جھٹ سے کسی جزیئے کی تلاش میں لگ جائیں، افتاء کے باب میں اصل الاصول یہ ہے کہ سوال میں پوچھے گئے امر کی حقیقت کو سمجھیں، پھر اس پر عبارات فقہیہ کو صحیح طور سے منطبق کریں، اس طرز عمل پر کچھ عرصہ مشق کرنے سے افتاء کی اہلیت اور ملکہ فقہیہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کے بغیر کثیر تعداد میں فتاوی لکھنے کے باوجود کامیابی کی ضمانت نہیں، مثلاً: ایک شخص نے سوال کیا کہ زید نے ایک شادی کی اس سے لڑکی پیدا ہوئی، اس کی شادی کروائی تو نواسی پیدا ہوئی، اس کو ایک شخص سے بیاہ دیا، بعد ازاں زید نے دوسری شادی کی، یہ بیوی فوت ہو گئی، پھر زید نے تیسرا نکاح کیا، اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، لڑکی جب جوان ہوئی تو زید اس کا نکاح بھی اپنے پہلے داماد سے کرنا چاہتا ہے، آیا یہ نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اگر یہ صورت مسئلہ آپ کتابوں میں تلاش کرنا شروع کریں تو ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئیگا، کیونکہ فقہاء وعلام الغیب نہ تھے کہ قیامت تک کی تمام صورتوں کو صراحۃ لکھدیتے، اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ پہلے اس مسئلہ کی حقیقت سمجھیں، پھر فقہی عبارات میں اس کا حکم تلاش کریں، اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص دو عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا چاہتا ہے، اور یہ دو عورتیں آپس میں باپ شریک خالہ اور بھانجی ہیں، اب آپ باب المحرمات میں یہ مسئلہ تلاش کریں کہ خالہ (حقیقی) اور بھانجی کو نکاح میں جمع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ بآسانی آپ مطلوبہ عبارت تلاش کر لیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بنیادی نکتے کو ایک اور مثال سے سمجھیں:

ایک شخص نے کوئی چیز پاکستانی روپے (مثلاً) دس ہزار میں خریدی، مالک کو اس نے روپے دینے کے بجائے ڈالر کا چیک دیا، مالک نے چیک وصول کر کے بینک سے رابطہ کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس اکاؤنٹ میں ڈالر موجود نہیں ہے، مالک نے خریدار سے رابطہ کر کے رقم کا مطالبہ کیا، اس عرصے میں چیک میں درج ڈالر کی قیمت دس ہزار سے بڑھ گئی، اب خریدار کہتا ہے کہ چیک واپس کرو میں آپ کو روپیہ دونگا، کیونکہ سودا اسی میں ہوا تھا، مالک کہتا ہے کہ اتنے قدر ڈالر ادا کرو جو تم نے روپے کے بدلے میں دینے منظور کئے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ بھی آپ کو کسی کتاب میں صراحۃً نہیں مل سکتا، ہاں اگر تمرین افتاء کے صحیح طرز کو اپنا کر غو کیا جائے تو بآسانی اسے حل کیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے ان دونوں کے درمیان کئے گئے معاملے کو فقہی اصطلاحات کی رو سے سمجھیں، روپے کے بدلے میں ڈالر کی ادائیگی پر فریقین کا رضامند ہونا ایک ورق نقدی کا دوسرے ورق نقدی کی سند کے ساتھ تبادلہ ہے، گویا کہ روپے کی بیع ڈالر کے ساتھ ہوئی، روپے بھی موجود نہیں واجب فی الذمۃ ہے۔ اور ڈالر بھی موجود نہیں، وہ بینک میں ہیں وہاں سے وصول کی تحریر (یعنی چیک) خریدار لکھ کر دے رہا ہے یہ بیع الدین بالدین ہوئی جو کہ ناجائز ہے، "للنهى عن بيع الكالئى بالكالئى"۔ لہٰذا یہ معاملہ اصل سے فاسد ہے، خریدار پر عقد کے مطابق روپے کی ادائیگی واجب ہے۔

اس سوال کا جواب تو ختم ہو گیا، لیکن اگر بطور مشق کے سوال کے بعض حصے کی تخریج کرنا چاہیں، تو دونوں ہوگی کہ بالفرض روپے کے ڈالر سے تبادلہ کی یہ صورت جائز ہوتی تو خریدار کا چیک دینا دین کا حوالہ ہے بینک پر، بینک میں رکھی گئی رقم قرض کی حیثیت رکھتی ہے، گویا خریدار نے اپنے اوپر واجب الاداء دین (ثمن) کو اپنے مقروض (بینک) پر حوالہ کر دیا، بینک کا چیک کی ادائیگی سے انکار دین کا "توی" ہے، "توی" کی صورت میں محتال لہ محیل پر رجوع کر سکتا ہے، لہٰذا بینک کا انکار سن کر مالک دوبارہ خریدار سے مطالبہ کر سکتا ہے، اور یہ مطالبہ ڈالر کا ہوگا، روپیہ کا نہیں، کیونکہ ڈالر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ " على مافرضنا "

اب آپ چاہیں تو اوپر ذکر کردہ فقہی مسائل کا حوالہ کتب فقہ سے دیکھ کر لکھ سکتے ہیں (یعنی بیع الدین بالدین کا ناجائز ہونا ہر دین کا حوالہ درست ہونا محتال علیہ سے دین کی وصولی نہ ہو سکنے کی صورت میں دوبارہ محیل پر رجوع کرنا وغیرہ) لیکن اگر آپ عقد کی حقیقت کو سمجھے بغیر ہی کسی جزیئے کی تلاش شروع کر دیتے تو سہل چیز کے حصول کی سعی کے لئے ایسا مشکل راستہ اختیار کرتے جس سے منزل تک پہنچنے کی اُمید خود منزل بنانے اور اس تک جانے کا راستہ بغیر کرنے والوں نے نہیں دلائی۔

حل استفتاء کے اسی طریقے کے متعلق فقہا نے فرمایا ہے:

" والغالب أن عدم وجرانه النص لقلة اطلا غه اورعدم معرفته بوضع المسئلة الزكورة فيه ، از قل ماتقع حادثة الا دلها ذكر فى كتب المذهب ،اما بعينها ، اوبذكر قاعدة تشتملها ". (شرح عقود رسم المفتى ص ۳۲).

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

O جواب اگر کلیات سے دیا ہو تو آخر میں لکھدیں: ''یہ جواب کلیات سے دیا ہے (یا قواعد کو سامنے رکھ کر دیا ہے) کوئی صریح جزئیہ نہیں ملا لہٰذا دوسرے حضرات سے بھی رجوع کر لیا جائے۔'' سائل اگر کلیات سے سوال کرے، مثلاً: کسی شخص نے اپنی ساس کو شہوت سے چھو لیا، کیا حکم ہے؟

تو جواب میں لکھدیں کہ کلیات سے سوال کرنا اصول کے خلاف ہے، جزئیات ظاہر کر کے پوری بات لکھو پھر جواب معلوم کر لے ایسے شخص کو ہر گز کلی حکم نہ بتائیں۔ نہ جانے کہاں منطبق کرے۔ پھر اگر وہ صورت مسئلہ بتا دے تو ''بر تقدیر صحت صورت مسئولہ'' کی تمہید کے ساتھ جواب دیں۔

مراجع ومظان:

سوال کی تحلیل وتحریر اور نکتۃ الغور کی تعیین کے بعد کتب سے مراجعت کی جائے اور مراجعت میں ایک کتاب کو دیکھ کر جواب لکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ بلکہ کئی کتابوں میں دیکھ کر جواب لکھا جائے اس کا فائدہ تو یہ ہوگا کہ تمام کتب سے مراجعت میں مسئلہ کے ہر پہلو سے آشنائی حاصل ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ کئی اور مسائل بھی نظر سے گزر جائیں گے، جو وسعت مطالعہ کی کلید اور بوقت ضرورت بہت مفید سرمایہ ہیں، حوالہ ایک کا نقل کر دینا کافی ہے۔ بوقت ضرورت زیادہ بھی نقل کیا جا سکتا ہے۔

O حل استفتاء کے بعد اردو فتاویٰ سے بھی رجوع میں کوئی حرج نہیں، تا کہ معلوم ہو سکے کہ اکابر نے ایسے استفتاء کے جواب میں کیا تحریر فرمایا ہے، اور ناقل کی تحریر میں ان کی تحریرات سے کتنا بعد ہے؟ خاص طور پر: امداد الفتاویٰ امداد المفتیین، امداد الاحکام، فتاویٰ محمودیہ، خیر الفتاویٰ، جواہر الفتاویٰ اور جواہر الفقہ کی مراجعت ہونی چاہیئے۔

O اردو فتاویٰ سے ہو بہو انہیں کے الفاظ سے استفادہ نقل کے مترادف ہے، جس سے کبھی بھی فتویٰ خود لکھنے کی استعداد پیدا نہیں ہوگی۔ ہاں اگر کوئی خاص مسئلہ مراجعت طلب ہو تو اس میں کوشش کی جائے کہ الفاظ اپنے ہوں، تا کہ منقولہ مضمون کی صحیح تعبیر کی اہلیت پیدا ہو سکے، اور اگر انہی الفاظ کا نقل کرنا ضروری ہے تو راوین میں نقل کیا جائے، تا کہ باقی نہ ہو۔

قاعدہ ہے کہ ایسے مسائل جن میں اشتباہ، التباس ہو یا ان میں اپنے موقف کی تائید وتقویت مفقود ہو تو اردو فتاویٰ کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔

عربی حوالہ میں اردو فتاویٰ کے حوالوں پر اکتفاء نہ کریں، بلکہ اصل کتاب کی طرف مراجعت کر کے اس کے صفحات اور جلد نمبر لکھیں۔ اگر کتاب دستیاب نہ ہو تو ''بحوالہ فلاں کتاب'' کی قید لکھی جا سکتی ہے۔

کتابوں سے مراجعت دل جمعی اور مستقل مزاجی کا کام ہے اس میں پوری ''جد'' صرف کرنے کے بعد ہی ''لم اجدہ'' کا قول معتبر ہوگا۔

اصولوں سے بے دھڑک جوابات کے بجائے جزئیات، تلاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیئے۔ اس لئے فقہی کتب سے واقفیت نہایت ضروری ہے، اس لئے فارغ اوقات میں مختلف کتب فقہ وفتاویٰ کا وقتاً فوقتاً مطالعہ کرتے رہیں، ایک مرتبہ جس کتاب کو ہاتھ میں لیں، اس سے عمومی اور جامع واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہی اس کو رکھیں، یہ وسعت مطالعہ میں اصل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

O اگر مسئلہ باوجود کوشش کے نہ ملے، تو صاف کہدیں کہ مجھے یہ مسئلہ معلوم نہ ہوسکا، آپ دوسرے حضرات سے پوچھ لیں، زبانی یا تحریری جواب صرف اس صورت میں دیں جب اپنی تحقیق، مسئلہ کی تخریج اور اس کی صحت پر پورا یقین ہو جائے کہ مسئلہ ایسا ہی ہے، جیسا آپ نے سمجھا ہے۔ بغیر تحقیق کے مسئلہ بتانا ناجائز وحرام ہے، مسئلہ نہ آتا ہو تو اس کے لئے ''لاادری'' کا قانون ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

''اذا خطأ العالم لأدری ، فقد أجیبت فقا تله .... الخ ''

یعنی جب کسی عالم کو مسئلہ معلوم نہیں تھا، اور اس نے اس پر ''لاادری'' نہیں کہا اور اٹکل سے جواب دیدیا تو اس پر شیطان ونفس کی ایسی ضرب لگی ہے کہ گویا اسے قتل ہی کردیا۔ ''مقاتل'' ان اعضاء کو کہتے ہیں جن پر ضرب لگنے کے بعد انسان زندہ نہ رہ سکے۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے بھی ایسی ہی روایت ہے۔

امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے:

'' جنة العالم لاادری ، اذا اغفله اصیبت مقاتله ''

کہ لاادری عالم کی ڈھال ہے اس کے ذریعہ جہنم سے بچ سکتا ہے۔ جس مسئلہ میں ذرا سا بھی شبہ ہو اس میں صاف کہدیا کہ ''لاادری'' تو بچ گیا اور اگر ''لاادری'' کی ڈھال کو استعمال نہیں کیا تو خطرناک چوٹ کھائی جو ہلاک کرسکتی ہے، ایک دفعہ ان سے اڑتالیس مسئلے پوچھے گئے، ان میں سے بتیس میں آپ نے فرمایا: ''لاادری'' یعنی ایک تہائی کا جواب دیدیا، اور'' تہائی کے متعلق فرمایا: ''لاادری''، اور ایک روایت ہے کہ آپ سے ایک مرتبہ چالیس مسئلے پوچھے گئے، آپ نے صرف پانچ (یعنی آٹھویں حصے، ثمن) کا جواب دیا، بقیہ کے بارے میں فرمایا کہ: ''لاادری''۔

حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں: ''**لاادری نصف العلم**'' آدھا علم لاادری میں ہے، امام مالکؒ کا تو نصف سے زیادہ علم اسی میں تھا۔ اگرچہ یہ کہنا کہ یہ مسئلہ مجھے معلوم نہیں نفس پر بہت گراں ہے، لیکن آخرت کی فکر اور انجام کا استحضار ہو تو یہ کچھ بھی مشکل نہیں، اس میں جو ذلت معلوم ہوتی ہے اسے اللہ تعالیٰ عزت سے بدل دیتے ہیں، سائل بھی آئندہ کے لئے ایسے مفتی پر زیادہ اعتماد کرنے لگتا ہے کہ فلاں مفتی صاحب جو مسئلہ بتاتے ہیں، اس کی ان کو پوری تحقیق ہوتی ہے، ورنہ نہیں بتاتے، لہٰذا جو کچھ وہ بتائیں وہ قابل اعتماد ہے۔

O مفتی کے لئے یہ تو ضروری ہے کہ اپنے امام کی فقہ کے مطابق فتویٰ دے، لیکن اس کی سوچ کا وسیع ہونا، احکام کی علل ودلائل پر گہری نظر ہونا، مسائل کے استنباط کا ملکہ ہونا اور دوسرے مذاہب کی تحقیقات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، دوسرے مذاہب کی تحقیقات سے استفادہ کرنے کے لئے '' **بدایة المجتهد المغنی ، المدونة الکبری ، الفقه الاسلامی وادلة** '' دیکھا کریں۔

O سوچ میں وسعت پیدا کرنے کا نسخہ یہ ہے کہ درج بالا کتب کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔

ہر فتویٰ لکھنے کے ساتھ حکم کی تحلیل بھی کیا کریں۔ یعنی وہ منقول من الکتاب والسنۃ ہے یا منقول مجتہد فیہ اگر منقول ہے تو کس سے ثابت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے؟ اور اس کا کیا درجہ ہے؟ اگر منقول ہے تو مجتہد کا قول ہے یا بعد کے ائمہ کا؟ اور کس اصل سے ماخوذ ہے؟ نیز وہ اصل کتاب وسنت میں مذکور ہے یا نفس اصل ہی ماخوذ ہوتا ہے؟ پھر اس کی معقولیت اب بھی باقی ہے یا صرف اسی زمانے کے رائج فلسفہ یا مزاج کے تابع تھی؟

تحریر فتویٰ:

اب لکھنا شروع کریں، اولاً رف کاغذ پر لکھا جائے رف کو 'اصلاح اول' اور اصل کو 'اصلاح دوم' کہتے ہیں۔ لکھتے وقت ذیل میں دیئے گئے آداب ملحوظ رہیں:

اصلاح اول:

○ اصلاح اول میں سطروں کے بیچ اور دونوں جانب مناسب جگہ چھوڑ دیں تا کہ اساتذہ کرام مطلوبہ اصلاح بسہولت کر سکیں۔

○ اپنے طور پر فتویٰ میں لکھے گئے حکم کے دلائل (نصاً ہوں یا استدلالاً) خوب تلاش کریں اور ان میں سے اہم فالاہم کو اصلاحِ اول میں لکھیں بھی، لیکن اصل پر صرف اس قدر حوالے لکھیں جتنے لابدی ہوں جس طرح ایک مدرس اپنے طور پر مسئلے کے مالہٗ وماعلیہ اور مکمل پس منظر سمجھنے کے لئے کئی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے، لیکن طلبہ کے سامنے اتنا بیان کرتا ہے جو نفسِ کتاب کے حل میں مددگار ہو، کبھی کبھی کوئی خارجی بات بھی بیان کر دیتا ہے۔ یہی فرق اصلاح اول ودوم میں ہے۔

اصلاح اول میں آپ مسئلہ کے ہر پہلو کو سامنے رکھ کر تحقیق درج کر سکتے ہیں، ایک سے زیادہ متعلقہ عبارات لکھ سکتے ہیں، چاہے مطلوب صراحتہً ثابت ہو رہا ہو یا دلالتہً، لیکن اصلاح دوم میں وہی درج کریں جو اصلاح دیکھنے والے حضرات نے باقی رہنے دیا ہو، ان کی طرف سے کی گئی قطع وبرید کا حتمی مطلب تغلیط نہیں ہوگا، تہذیب کے پیش نظر بھی وہ عبارات کو کم کرتے ہیں، اس سے پست حوصلہ نہ ہونا چاہیئے۔

اصلاح دوم:

○ اصلاح دوم میں صاف اور خوشخط لکھنے کی پوری کوشش ہو، پورے پورے حرف ہوں، سب نقطے اور شوشے دیئے ہوں نیز خط متوسط ہو نہ بہت موٹا ہو نہ بہت باریک، اسی طرح حروف سے پشت پر

(۱) "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لمعاویةؓ وکان کاتبہ یکتب بینہ وبین العرب: "لق الدواة وحرف القلم .... وانصب الباء، وفرق السین، ولا تعوّر المیم، وحسن اللہ ومد الرحمن، وجود الرحیم، وضع قلمک علی اذنک الیسریٰ، فانہ أذکر لک."

(قولہ: لِقِ الدواة) بضم اللام وکسر القاف مخففة الأمر من لقتہ الوقہ تقول لقت الدواة اذا اصلحت مدادھا.

(قولہ: حرف القلم) امرمن التعریف ای أجعل القلم محرفاً".

ترجمہ: "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر معاویہؓ سے فرمایا (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آپ کے کاتب تھے) "دوات کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیاہی درست رکھو، قلم پرتر چھا قط لگاؤ "ب" کو بڑا کرو، سین کے دندانوں کو واضح کرو، میم کی آنکھ کو خراب نہ کرو، "اللہ" کو خوبصورت لکھو "رحمٰن" کو (یعنی س کو نون کو) دراز کرو، "الرحیم" کو عمدگی سے لکھو، قلم کو اپنے بائیں کان پر رکھو، کیوں کہ یہ طریق تجھے خوب مضمون یاد دلانے والا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ (نثر المرجان فی رسم نظم القرآن ۱/۳۷).

(۲)عن زيد بن حبيب أن كاتب عمر وبن العاص رضى الله عنه كتب الى عمر رضى الله عنه فكتب بسم الله ولم يكتب لها سيناً فضربه عمرؓ فقيل له فيم ضربک يا امير المؤمنين ؟ قال نصربتى فى سين .... (الاتقان ج : ۴/ص ۱۸۰)........

سابقہ مضمون میں اگر چہ یہ باتیں گزر چکی ہیں مگر کچھ مزید اضافہ کے ساتھ شامل کئے جاتے ہیں:

O اہم "علامات ترقیم" کا پورا پورا اہتمام کیا جائے ۔سکتہ (،)، ختمہ (۔) اور واوین کا برمحل استعمال لازمی سمجھیں۔

O جہاں سوال کی عبارت ختم ہو وہیں سے متصل نیچے جواب لکھنا شروع کریں۔ صفحے کے آخر میں "جاری ہے" یا "ورق الٹیے" لکھیں، اگر اسی صفحہ پر جگہ نہیں تو سوال کی پشت پر جواب لکھیں اس میں تزدیر اور جعلسازی سے حفاظت ہے۔

O الجواب حامداًومصلیاً وغیرہ درمیان میں لکھا جائے۔

O صفحے کے دونوں جانب ایک برابر حاشیہ چھوڑ کر لکھنا شروع کریں۔

O اصلاح دوم میں دائیں طرف نسبتاً زیادہ حاشیہ چھوڑیں تا کہ عکاسی اور جلد بندی میں سہولت رہے۔

O پہلی سطر حاشیے سے تین لفظ کی جگہ چھوڑ کر لکھیں، بقیہ سطریں حاشیہ کے ساتھ سے شروع کریں۔

O ایک پیرا مکمل ہو جائے تو دوسرا شروع کرتے ہوئے بھی پہلی سطر تین لفظ کی جگہ چھوڑ کر اور بقیہ سطریں حاشیے سے شروع کریں۔

O عربی حوالہ نقل کرتے وقت دونوں جانب اردو عبارت کی بنسبت زیادہ جگہ چھوڑی جائے اور اس کے شروع وآخر میں واوین لگا کر اسے ممتاز کیا جائے، یہی طریقہ ہر اس عبارت میں اپنایا جائے جو بلفظ نقل کی جائے۔

ان امور کا اہتمام کریں کہ یہ مسئلہ آداب تحریر میں سے ہیں۔

O جواب مکمل ہو جائے تو " فقط و الله اعلم " لکھیں، عقائد اور اصول کے مسائل میں " والله الموفق " لکھیں۔

O ناقل اپنا نام بھی اسی کے ساتھ یا ایک سطر نیچے لکھے۔

O اصل کاغذ پر دوہری لکھائی یا کاٹ پیٹ ہرگز نہ ہونی چاہیئے۔ کوئی چیز مٹانی ہو تو سلیقے اور صفائی سے سفیدے کے ساتھ مٹائیں، اضافہ کرنا ہو تو " علامة الالتحاق " بصورت " ذنب السهم " (٧) استعمال کریں۔

O اصلاح دوم میں ترقیم نہ ہوئی یا کاٹ پیٹ پائی گئی تو نہ دیکھی جائے گی۔

O اصلاح دوم لکھنے کے بعد اس پر نظر ثانی کریں، سقط فی النقل کی اصلاح خود طالب علم کی ذمہ داری ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجزاءفتویٰ:

O کسی بھی فتویٰ کے عام طور پر تین بنیادی اجزاء ہوتے ہیں۔

(۱)تمہید،(۲)نفس جواب،(۳)خاتمہ۔

(۱)تمہید:

یہ ہر فتویٰ میں نہیں لکھی جاتی صرف طویل یا اہم جوابات کے شروع میں ہوتی ہے اس میں آئندہ تحریر کئے جانے والے حکم کا پس منظر یا ایسے فقہی قواعد یا کلی امور دیئے جاتے ہیں جن پر جواب کی تفریع کی گئی ہو، کبھی ایسے مقدمات لکھے جاتے ہیں جو جواب کی بنیاد اور دلیل کا کام دیں۔ جب حکم میں یک گونہ غرابت و نادر ہو تو اس سے پہلے ایسی تمہید لکھنی چاہیئے جس سے حکم کی وضاحت ہو اور جو اس کے لئے مقدمہ بن سکے۔

(۲)نفس جواب:

یہ سب سے اہم، بنیادی اور مقصودی جزء ہے، اکثر فتاویٰ میں صرف اس پر اکتفا کیا جاتا ہے، یہ دو چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے، حکم اور دلیل۔ کوشش کی جائے کہ یہ جز عقلی و منطقی انداز میں مرتب ہو حکم مسئلہ واضح انداز میں تحریر ہو، دلائل و تفصیل میں منطقی ترتیب اور ربط کا خیال رکھا جائے۔ اگر سوال میں کسی بات کے حق میں دلائل دیئے گئے ہیں یا اشکالات اٹھائے گئے ہیں تو ان کا جواب بھی مناسب معروضی ترتیب کے ساتھ درج کیا جائے۔

(۳)خاتمہ:

تمہید کی طرح یہ جز بھی صرف طویل یا مخصوص فتاویٰ میں لکھا جاتا ہے۔ تمام جوابات میں نہیں، عمومی طور پر اس کا مضمون یہ ہوتا ہے کہ عقائد سے متعلق سوال کے آخر میں سب مسلمانوں کے لئے ہدایت کی، بدعات و رسوم وغیرہ سے متعلق جواب میں ان سے بچنے کی توفیق نصیب ہونے کی، اور اختلافی مسائل میں مسلمانوں کو صراط مستقیم پر قائم رہنے کی دُعا دی جاتی ہے۔ نزاعی مسئلہ ہو تو فریقین کو حکم شرعی مان لینے کی ترغیب دی جاتی ہے وغیر ذلک۔

اُسلوب فتویٰ:

O فتویٰ کی عبارت معتدل، متوازن اور متناسب ہونی چاہیئے اس میں ایجاز مخل ہو نہ اطناب ممل۔ حد سے زیادہ اختصار بھی ٹھیک نہیں تحریر میں کسی قسم کا الجھاؤ یا ابہام قبیح عیب ہے اور ضرورت سے زیادہ تطویل بھی مناسب نہیں۔

O جواب ہمیشہ عام فہم اور آسان زبان میں تحریر کیا جائے تا کہ مخاطب اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لے اور نتیجے تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو، عملی اصطلاحات اور عربی و فارسی تراکیب استعمال نہ کی جائیں۔

پہلے زمانے میں علم دین کا چرچا تھا اس لئے لوگ علمی وفقہی اصطلاحات سے مانوس تھے، مستفتی خواہ عالم نہ ہو مگر بحیثیت مجموعی مفتی کی مراد ٹھیک سمجھ لیتا تھا، اگر خود نہ سمجھتا تو ہر بستی میں ایسے لوگ موجود تھے جو کنز کافیہ تک پڑھے ہوئے تھے وہ اسے فتویٰ کا مطلب سمجھا دیتے تھے۔

اب صورتِ حال برعکس ہے اس لئے سائل عامی ہو تو جواب کی عبارت اس کی ذہنی سطح کی مناسبت سے عام فہم ہونی چاہیئے، مثلاً آجکل لوگ ''حقوق ثلاثہ مرتبہ مقدمہ علی الارث'' کا مطلب نہیں سمجھتے اس لئے تقسیم وراثت کے مسائل میں اس کے بجائے آسان الفاظ لکھنے چاہیئے، البتہ اگر مستفتی عالم ہو تو جواب علمی زبان میں لکھنے میں حرج نہیں۔

○ مفصل فتوؤں میں بعض اوقات مسئلے کے احکام، اس کے دلائل اور شبہات کے جوابات اس طرح گڑ بڑ ہو جاتے ہیں کہ عام پڑھنے والے کا ذہن الجھ جاتا ہے اور سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے نہ صرف پورا فتویٰ پڑھنا پڑتا ہے بلکہ بعض اوقات پورے فتویٰ کو پڑھ کر بھی بآسانی جواب کا خلاصہ ذہن میں نہیں بیٹھتا اس لئے فتوی میں مسئلے کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہئیں تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو وہ بآسانی حکم معلوم کرلے اور جس شخص کو دلائل سے دلچسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے، فتویٰ میں عام آدمی کے لئے تو صرف حکم ہی ہوتا ہے، دلائل اہل علم کے لئے ہوتے ہیں۔ اس لئے عام آدمی کو فتویٰ کے شروع ہی میں مختصراً یہ بات واضح طور پر معلوم ہونی چاہیئے کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس کا مختصر جواب کیا ہے اس جواب کے بعد اہل علم کے لئے دلائل کی تفصیل، حوالے اور شبہات کے جواب جتنی تفصیل سے چاہیں دیدیئے جائیں۔

خلاصہ:

یہ کہ فتویٰ نویسی کا بہترین اسلوب بقول مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ یہ ہے کہ ''پڑھنے والے کو سوال کا جواب تو پہلے ہی لفظ سے مل جائے پھر کوئی دلائل پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھے، نہیں پڑھنا چاہتا، تو چھوڑ دے، نرا حکم معلوم کرنے کے لئے پورا مفصل فتوی پڑھنے کی ضرورت نہ پڑے'' (البلاغ، مفتی اعظم نمبر ۱۳۹۹)...........

○ سوال بعض اوقات نہ درتہ ہوتا ہے، اور سوال کرنے والا تمام باتوں کو خلط ملط کر کے پوچھتے ہے ایسے مواقع پر سوال کا تجزیہ وتنقیح کر کے حل طلب امور کی عقلی ''معروضی ترتیب دے کر لکھ دی جائے کہ ''اس مسئلے میں یہ باتیں قابل غور ہیں'' پھر ان منقح امور کا ترتیب وار جواب دیا جائے۔

○ مفتی کے لئے جائز ہے کہ اسلوب الحکیم اختیار کرتے ہوئے اصل پوچھی گئی چیز کی بجائے جو انفع المسائل ہے اسے تحریر کرے۔

قال اللہ تعالیٰ: ''یسألونک ماذا ینفقون قل ما أنفقتم من خیر فللوالدین والا قربین والیتمیٰ''.

○ یہ بھی درست ہے کہ پوچھی گئی باتوں کے علاوہ حسب مواقع مزید مفید باتوں کا اضافہ کر دیا جائے اتباعاً للحدیث المعروف:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ھو الطھر ماؤہ والحل میتۃ" امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب باندھا ہے۔

"باب من اجاب السائل باکثر مما سائل" پھر اس میں حدیث ابن عمرؓ ذکر کی ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا ما یلبس المحرم ؟ آپؐ نے فرمایا: لا یلبس القمیص ولا العمائم ولا السراویلات ولا الخفاف ..... الحدیث).

○ جو مسائل بہت واضح ہیں محتاج تفصیل نہیں یا اکثر و بیشتر پوچھے جاتے رہتے ہیں ان میں یجوز یا لا یجوز یا مناسب، یا نامناسب جیسے مختصر جواب بھی دیئے جاسکتے ہیں۔

○ مفتی کو اگر صورت واقعہ کا علم ہے اور سوال میں ویسی تحریر نہیں کیا گیا تو سائل سے اصل صورتحال سوال میں لکھوائے یا یہ خود جواب میں یوں لکھے کہ یہ واقعہ چونکہ دراصل یوں ہے۔ لہٰذا اس کا جواب یہ ہے۔

○ جب قرینے سے معلوم ہو کہ جواب مستفتی کی غرض کے خلاف ہے اور وہ اسے اپنے کاغذ پر لکھنا پسند نہیں کرے گا تو اس کو زبانی جواب دینے پر اکتفاء کرنا مناسب ہے۔

○ مفتی کو سائل یا اس کے خصم کی طرف رجحان یا جھکاؤ اختیار نہیں کرنا چاہیئے اس رجحان و میلان کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔

مثلاً

(۱) یہ کہ مالہٗ کو ذکر کر دیا جائے ماعلیہ کو چھوڑ دیا جائے۔

(۲) یا دعویٰ کا جواب اور ان سے چھٹکارے کا طریقہ خود سے بیان کرنا شروع کر دیا جائے۔

○ بعض مسائل میں تغلیظ فی الجواب کی ضرورت ہوتی ہے ایسے موقع پر مفتی کو سخت الفاظ لکھنے چاہیئے۔

مثلاً

"یہ مسئلہ قرآن وحدیث، اجماع امت سے ثابت ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں" یا "یہ جمہور امت کا مسلک ہے اس سے انحراف سخت گمراہی و بے دینی ہے۔" "یا فوری علیحدگی فرض ہے اکٹھے رہنا حرام کاری کا ارتکاب ہے" وغیرہ وغیرہ۔

بعض اوقات کسی مسئلے کا جوں کہ توں فقہی حکم بیان کرنے سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے، مثلاً ایک چیز فی نفسہ مباح ہے لیکن اس کی کھلی چھوٹ دیدینے سے اندیشہ یہ ہے کہ بات معصیت تک پہنچے گی، اور لوگ شرعی حدود پر قائم نہیں رہینگے، ایسے موقع پر مفتی کو یہ بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے کہ اس کام کی حوصلہ افزائی نہ ہو، اور دوسری طرف فقہی حکم میں تصرف بھی نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے منقول ہے کہ ایسے موقع پر مفتی کو اپنا جواب فتویٰ کے بجائے مشورہ کے طور پر لکھنا چاہیئے۔
ایسے مواقع پر اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ "فلاں عمل مناسب نہیں، یا درست نہیں، یا اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

......☆☆☆☆☆......

© rasailojaraid.com